ڈاکٹر محمد ریاض ـــــ سنٹرل گورنمنٹ کالج اسلام آباد

میر فتح اللہ شیرازی اور ان کی ایجادات

میر فتح اللہ شیرازی حسینی سید تھے - آپ نے زندگی کے کوئی تیس برس جنوبی اور شمالی ہند میں گزارے - آپ کے جوہر یہیں چمکے اور آپ یہیں پیوندِ خاک ہوئے مگر برِ صغیر میں ورود سے قبل وطن میں بھی آپ کی کافی شہرت تھی - یہی شہرت انھیں برِ صغیر میں لے آئی، اس کے باوجود یہ بات باعثِ حیرت ہے کہ ان کی ابتدائی زندگی کے بارے میں ایرانی اور دوسرے مآخذ خاموش ہیں -

فتح اللہ شیرازی نے شیراز اور ایران قدیم کے دیگر شہروں میں کسبِ کمال کیا - وہ متداول معقول و منقول علوم میں ماہر ہونے کے علاوہ مخترعانہ ذہن رکھتے تھے - دستکاریوں اور میکانکی کاموں سے انھیں بغایت دلچسپی تھی - فنِ تدریس میں بھی وہ طاق تھے - ان ہی خصوصیات کی بنا پر ان کا شہرہ برِ صغیر تک پہنچا اور بیجاپور کے معارف پرور حاکم، ابراہیم عادل شاہ اوّل نے انھیں دعوت دی کہ اس کے یہاں آجائیں - تواریخ اور تذکروں کی کتابوں سے ظاہر ہے کہ سلطان نے کئی خط لکھے، تحائف بھیجے اور نقد رقم ہدیہ کی، تب میر فتح اللہ نے بیجاپور جانے کا عزم کیا اور چند دن بعد اس سفر پر روانہ ہو گئے - آپ ۹۶۵ھ یا اس کے بعد بیجاپور آئے اور ابراہیم عادل شاہ اوّل کی عنایات کا مصداق بنے -

میر فتح اللہ ولی عہد علی عادل شاہ کے اتالیق تھے - مذہبی عقائد کے اعتبار سے وہ شیعہ تھے مگر شاہزادے کو فقہ حنفی کے مطابق ہی تعلیم دی - علی عادل شاہ اپنے استاد سے بے رخی برتتا تھا - برسرِ اقتدار آنے کے بعد، اس نے ان کو اس قدر بد دِل کر دیا کہ وہ برِ صغیر کے مختلف علاقوں میں چکر کاٹتے رہے اور کئی بار ارادہ کیا کہ شیراز لوٹ جائیں - ان حالات میں ۹۸۸ھ میں عادل شاہ قتل ہو گیا اور میر کا قدر دان شاہزادہ ابراہیم عادل شاہ ثانی برسرِ اقتدار آیا - آپ بیجاپور لوٹ آئے اور پہلے سے بھی زیادہ محترم و محتشم بنے - دو سال بعد ان کی ملاقات شیخ ابوالفیض فیضی (متوفی ۱۰۰۴ھ) سے ہوئی - فیضی ان دنوں دکن کی ایک مہم سے لوٹ رہا تھا - اس نے میر کا نام سن رکھا تھا - ان سے مل کر

بے حد متاثر ہوا اور ان سے فرمائش کی کہ دربارِ اکبری میں تشریف لائیں۔ میر فتح اللہ نے اس معاملے پر سوچنے کا وعدہ کیا مگر فیضی نے جلد ہی انھیں اکبر کی طرف سے مدعو کروا دیا۔ اکبر نے حاکمِ بیجاپور کو بھی لکھ بھیجا کہ میر فتح اللہ کو فتح پور سیکری بھیج دیا جائے۔ نتیجۃً آپ نے ۹۹۰ھ میں دربارِ اکبری میں حاضری دی۔

میر فتح اللہ کو ہر طبقۂ خیال کے علما و فضلا کی حمایت حاصل تھی۔ ان کے علم و فضل اور مخترعانہ صلاحیت کا ہر کوئی مُقِر تھا۔ ابو الفضل، عبد القادر بدایونی اور صاحبِ تاریخ فرشتہ، سب ہی ان کے فضائل میں رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ابو الفضل علّامی انھیں "قدوۂ علمائے روزگار، علامۃ الدہر، بینندۂ حقائقِ اشیا" کے القاب سے یاد کرتا ہے۔ (اکبر نامہ ج ۱)۔ ان کے اساتذہ، جمال الدین محمود، کمال الدین سعود، میر غیاث الدین منصور اور مولانا احمد کو ان پر فخر تھا۔ انھیں تدریس کا بے حد شوق تھا۔ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح گیلانی کے خورد سال بچے بھی ان کے پاس پڑھتے تھے مگر شاگردوں کے ساتھ ان کا سلوک اچھا نہ تھا۔ میر جوشِ تدریس میں بدکلامی کے عادی تھے اور اسی لیے لوگ ان کے درس میں شامل ہونے سے گھبراتے تھے۔ اسی عادت نے علی عادل شاہ کو ان کے خلاف کیا تھا اور بدقسمتی سے انھیں کوئی ایسا اچھا شاگرد نصیب نہ ہو سکا۔ جو ان کے نام کو زندہ رکھ سکتا۔

اکبر کے ہاں میر کو بڑا اقبال حاصل رہا۔ وہ آتے ہی سہ ہزاری منصب پر فائز کیے گئے اور چار دیہات پر مشتمل جاگیریں بھی انھیں ملیں۔ امیر کو امین الملک، عضد الدولہ اور عضد الملک کے خطابات بھی ملے۔ راجہ ٹوڈرمل نے جن قانونی اور دیوانی اصلاحات کی سفارش کی تھی، ان کو تیار کرنے میں میر فتح اللہ کا ہاتھ بھی تھا۔ انھیں خانِ اعظم کے ساتھ حیدرآباد دکن کی مہم پر بھیجا گیا تھا۔ ۹۹۷ھ میں وہ اکبر کے ساتھ کابل گئے اور وہاں سے کشمیر جانے میں شاہنشاہ کی معیت کی۔ اسی سفر میں وہ تپِ محرقہ میں مبتلا ہو کر ۳ شوال ۹۹۷ھ کو انتقال فرما گئے۔ اکبر کو بے حد رنج ہوا اور کئی دن تک سوگوار رہا۔ اس نے پہلے حکم دیا کہ ان کی نعش کو حضرت میر سید علی ہمدانیؒ کے نام سے منسوب خانقاہ "خانقاہِ معلّٰی" واقع سرینگر سے متصل دفن کیا جائے، مگر دوسری بار فرمایا کہ کوہِ سلیمان پر دفن کریں۔ کوہِ سلیمان واقع سرینگر میں ان کی قبر ابھی موجود ہے۔ فیضی نے آپ کے الم میں ایک دردناک مرثیہ لکھا۔ فتح اللہ شاہ کی وفات کے چند روز بعد حکیم ابو الفتح گیلانی بھی انتقال فرما گئے۔ فیضی نے دوسرے مرثیے میں میر فتح اللہ اور حکیم موصوف کا ایک ساتھ ماتم کیا ہے۔ دونوں طویل مرثیوں (ایک ترکیب بند اور دوسرا قصیدہ نما)

کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

سخن سنجی کہ با روح القدس میکرد دمسازی ‌‌‌‌‌‌ سبق می بردازروح الامین درعرش پردازی
ضمیرش در تفکر کامیابِ آسمان سیری ‌‌‌‌‌‌ زبانش در تکلّم عاشقِ گنجینہ پردازی
دو صد بو نصر رفت و بو علی تا او پدید آید ‌‌‌‌‌‌ بسی دارو قضا در تہ دکان زینگونہ بزازی
گہی با محمل مشائیان گردِ زمین گردی ‌‌‌‌‌‌ گہی با موکبِ اشراقیاں گرد فلک تازی
گرامی امہاتِ فضل را فرزند روحانی ‌‌‌‌‌‌ ابو الآبائی معنی ، شاہ فتح اللہ شیرازی
شہنشاہِ جہاں را در وفاتش دیدہ پُر نم شد ‌‌‌‌‌‌ سکندر را شکِ حسرت ریخت کافلاطون زعالم شد

مُدّعیِ اجل ، بہ نہاں خانہای خاک ‌‌‌‌‌‌ ببرد آن یگانہ ہای جہان رایگان یگان
زآنہا دو نام در خلف الصدق روزگار ‌‌‌‌‌‌ کافلاک شان نزاد بہ جمل دو صدِ قران
اوّل امام دین ، عضد الدولہ ، بحرِ علم ‌‌‌‌‌‌ قرامۂ حقیقت و علاقۂ زمان
شاہ سہیل ناصیہ ، فتح اللہ آن کہ عقل ‌‌‌‌‌‌ با چرخ آفتاب نہد پلہ اش گران
از حکمتِ الٰہیِ او ، عقل مستفید ‌‌‌‌‌‌ وز دقتِ ریاضیِ او غیب ، مستعان[۵]

میر فتح اللہ بڑے با اصول ، جری اور متدین شخص تھے ۔ عہدِ اکبری کے علما نے انھیں دینی تحریفات اور بدعات کی طرف راغب کرنے کی بڑی کوشش کی ۔ دینِ الٰہی کی ہمنوائی کی خاطر ان پر ہر طرف سے ڈورے ڈالے گئے مگر یہ طائرِ بلند بال دام میں نہ پھنسا ۔ نماز کے وقت دربار میں تجدّد و بدعت کی بات جاری ہوتی ، اور یہ "لاحول" پڑھ کر اٹھ کھڑے ہوتے اور سب کے سامنے مسلکِ تشیع کے مطابق نماز ادا کرتے ۔ ان کی مرنجاں مرنج سیرت اور عظیم لیاقت سے سب اس قدر متاثر تھے کہ کسی نے ان کے خلاف کوئی بات نہ کی ۔ مگر یاد رہے کہ دینِ الٰہی کی حمایت یا مخالفت کے بارے میں میر فتح اللہ عموماً مہر بہ لب رہے ہیں ۔

تصانیف

فتح اللہ شیرازی سے منسوب چند تصانیف بتائی جاتی ہیں ۔ ایک منہاج الصادقین فی الزام المخالفین

---

۵ ۔ اے ۔ ڈی ارشد ، کلیاتِ فیضی لاہور صفحہ ۴۹ ، ۷۶

نامی تفسیر ہے جو پانچ جلدوں میں ہے، مگر یہ تفسیر درحقیقت ملا فتح اللہ کاشانی کی تالیف ہے 'فتح اللہ' نام کے اشتراک کی بنا پر اسے شیرازی کی تالیف بتایا جارہا ہے۔

خلاصۃ المنہج: ایک دوسری تالیف ہے جو مذکورہ تفسیر کا خلاصہ بتائی جاتی ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ (نمبر ۶۳۸) کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے فارسی مخطوطات میں مندرج ملتا ہے۔

'تاریخ الفی' کو جن سات حضرات نے تالیف کیا، ان میں ایک میر فتح اللہ بھی تھے۔ آزاد نے لکھا ہے (دربارِ اکبری) کہ میر موصوف نے ایک رسالے میں 'وادیٔ کشمیر' کے حالات لکھے ہیں اور اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے ان واقعات کو 'اکبرنامہ' میں ضم کردیا۔ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آزاد کا یہ بیان کس حد تک واقعات کے مطابق ہے؟ ابوالفضل نے تو اس کی تصریح نہ کی، اور کشمیر کے بارے میں جو کچھ 'اکبرنامہ' میں پڑھتے ہیں، وہ ابوالفضل کا سبکِ نگارش نظر آتا ہے۔

میر نے 'دورہ شمسیہ' پر مبنی ایک تقویم بنائی اور اکبر کو پیش کی۔ بظاہر یہ تقویم جلال الملک ملک شاہ سلجوقی کے دور میں مروج ہونے والی 'تقویم' کے مشابہ تھی۔ تقویم جلالی کو حکیم عمر خیام نے مرتب کیا تھا۔ یہ سن جو ہجرت سے ہی شمسی حساب سے آغاز پذیر ہے، ایران و افغانستان میں ہنوز رائج ہے۔ میر فتح اللہ نے 'سن الٰہی اکبرشاہی' کو آنحضرتؐ کے وصال سے شروع کیا تھا اور بعد میں جہانگیر نے اسے منسوخ کردیا۔ میر فتح اللہ کی نگارشات میں آخری تحریر "زیچ جدید" ہے۔ جس میں انھوں نے اکبر کا زائچہ بڑی قابلیت سے درست کیا تھا۔ تفسیر، حدیث، کلام، حکمت، فلسفہ، ہیئت، نجوم، رمل، اور ریاضیات میں ان کے غیر معمولی تبحر کے مقابلے میں یہ تصانیف ناچیز ہیں۔

اختراعات و ایجادات

میر فتح اللہ شیرازی کا موجدانہ ذوق و ہنر، معاصرین کے لیے باعثِ قدردانی اور تعجب تھا۔ اکبر نے سن رکھا تھا کہ میر زبردست ہنرمند اور میکانکی ایجادات کے شائق ہیں اور اس بات کا تجربہ ان کی آمد کے چند ہی ماہ بعد ہوگیا۔ فتح اللہ ۹۹۰ھ میں اکبر کے دربار میں شامل ہوئے اور اسی سال امیر مظفر خان کی صاحبزادی سے عقد کیا۔ چند ماہ بعد نوروز آگیا۔ اور اکبر کا اس جشن کے بارے میں اہتمام سب کو معلوم ہے۔ اس نے حکم دیا کہ ہر امیر اپنا ایوان شایانِ شان طریقے سے سجائے۔

اور یہ بھی بتادیا کہ وہ ہر ایوان میں گزرے گا۔ شاہنشاہ جب ایوانات امرا دیکھنے آیا تو میر فتح اللہ کا ایوان دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہاں نوروز کے اہتمامات کے علاوہ گھڑیال، علم ہیئت کے آلات، کرّے، اصطرلاب، جرّ الثقال کی میکانکی کلیں، نظامِ فلکی کے نقشے اور سیارات و افلاک کی اشکال کی حرکت، دیدہ و دل کو جلب کر رہی تھیں۔ اکبر نے اس منظر کی بے حد تعریف کی کیونکہ مذکورہ اشیا میر فتح اللہ کے ذوق و سلیقہ کی غماز تھیں۔

میر فتح اللہ کی ایجادات ہی ان کے بڑے کارنامے ہیں مگر افسوس کہ ان اختراعات کی پوری کیفیت معلوم نہیں۔ تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں جو مندرجات ملتے ہیں، ان کے بارے میں ملخص معلومات حسب ذیل ہیں:

۱۔ دُور بین نما آئینہ۔ اس آئینے کے بارے میں اتنا معلوم ہے کہ اس میں دُور و نزدیک کی اشیا عجیب وغریب دکھاتی دیتی تھیں۔ قریب کی اشیا بڑی نظر آتی تھیں۔ دُور کی اشیا کافی بڑی بن جانے کے علاوہ قریب لگتی تھیں۔ اس قسم کا آئینہ میر موصوف نے اکبر کو پیش کیا اور ایک دوسرا اپنے مکان واقع آگرہ میں رکھا۔ صاحبِ دربارِ اکبری کی روایت ہے کہ ابوالفیض فیضی اس مکان اور اس میں موجود اشیا، از انجملہ اس آئینے کو دیکھ غرقِ حیرت ہو گیا تھا۔

۲۔ بارہ گولیوں والی بندوق۔ میر فتح اللہ نے ایک ایسی بندوق بنائی جس میں بارہ گولیاں ڈالی جاتی تھیں۔ یہ گولیاں، موجودہ خودکار ہتھیاروں کی تکنیک کے مطابق، دبانے سے خود بخود نکلتی جاتی تھیں۔

۳۔ قلعہ شکن توپ۔ میر فتح اللہ کی ایجاد کردہ قلعہ شکن توپ کی ابوالفضل، بدایونی اور فیضی نے بے حد تعریف کی ہے۔ طبقاتِ اکبری اور مآثر الامرا (ج ۱) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ توپ جنگوں میں کام میں لائی گئی اور کئی مضبوط قلعے توڑ ڈالے گئے۔ یہ معلوم نہیں کہ آیا ایسی ایک ہی توپ بنی تھی یا متعدد۔

۴۔ ہوائی چکی۔ یوں تو میر کی مندرجہ بالا سہ گانہ ایجادات میں ان کی مخترعانہ شان جلوہ گر ہے، مگر ہوائی چکی ان کی اختراعات میں نمایاں ترین مقام پاتی ہے۔ بظاہر ہالینڈ میں "وِنڈ مل" میر فتح اللہ کے دورِ حیات کے کوئی پچاس سال بعد بنی۔ ان سے پہلے "ہوائی چکی" (بادآسیا) دنیا

میں شاید ہی کہیں بنائی گئی ہو۔ برصغیر کے لوگوں کے لیے یہ ایک بالکل نئی چیز تھی۔ یہ خود گرد آسیا ' میر نے فتح پور سیکری کی ایک پہاڑی کی چوٹی پر لگائی تھی۔ بعض مورخین اسے 'پن چکی' کا نام دیتے ہیں، اور ہو سکتا ہے کہ 'ہوائی چکی' اور 'پن چکی' دونوں ہی بنائی اور لگائی گئی ہوں۔ 'آثارِ اکبری' مطبوعہ آگرہ میں مرقوم ہے کہ فتح پور سیکری کے موضع 'چریاری' میں میر فتح اللہ کی بنا کردہ عظیم 'ہوائی چکی' کے آثار ابھی موجود ہیں۔ اس چکی میں اعیان و اکابر اور دوسرے لوگ ہر قسم کے اناج کا آٹا پسواتے تھے۔

یادگارِ شبلی

از : ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کو ہمارے ادب اور علمی و فکری تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے احوالِ زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۴۳ء میں حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے۔ تصانیف کے بارے میں وہ ایک علاحدہ کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر محمد اکرام صاحب کی اس کتاب یادگارِ شبلی میں نہ صرف مکمل حالاتِ زندگی ہیں (اور اس ضمن میں وہ مواد سمیٹ لیا گیا ہے جو حیاتِ شبلی کی اشاعت کے بعد شائع ہوا یا سید صاحب کو کسی وجہ سے دستیاب نہ ہو سکا) بلکہ علامہ شبلی کی ہر ایک کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ بھی شامل ہے۔

علامہ شبلی ایک جامع حیثیات ہستی تھے۔ وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کے مصنف، معلم، مورخ، شاعر اور سیاست دان تھے۔ انھوں نے سولہ برس علی گڑھ کالج میں سرسید کے دستِ راست کی حیثیت سے گزارے اور علی گڑھ تحریک کے رکنِ رکین رہے لیکن وہ ندوۃ العلما کے بھی "جزوِ غالب" تھے اور علما کی تنظیم اور قدیم کی پاسداری کے لیے عمر بھر سرگرم عمل رہے۔ قدیم و جدید کی نسبت ان کا طریقہ خذ ما صفا دع ما کدر کا تھا اور انھوں نے ان دونوں میں سے بیچ کی راہ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

یادگارِ شبلی اس جامع حیثیات ہستی کی زندگی، کارناموں اور تصانیف کے طویل اور غائر مطالعہ کا ماحصل ہے انشاء اللہ اس سے نہ صرف شبلی شناسی کی نئی راہیں کھلیں گی بلکہ قوم کے فکری مسائل سمجھنے اور ان کا مناسب حل تلاش کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

ضخامت : ۴۶۸ صفحات ۔ قیمت : ۱۴/- روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ لاہور